قسط:۲

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

والد محترم نذیر مجیدیؒ (۱۹۰۵۔۱۹۹۳)

''شہرلبِ دریا'' کے مصنّف نے میرے والد مرحوم کے بارے میں جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ اُن کی پوری زندگی کی ادھوری کہانی ہے۔ جب یہ کتاب زیرِ ترتیب تھی تو میری اُن سے ملاقات نہ ہوسکی ورنہ میں اُنہیں کچھ اور واقعات بھی بتاتا۔ اُن کی تحریر میں والدِ محترم کی صرف صحافتی زندگی کی ایک جھلک موجود ہے یا پھر اُن کے رفاہی اور اصلاحی کاموں کا ایک ادھورا سا ذکر جو وہ اپنی زندگی میں محض اللہ کی رضا کی خاطر سرانجام دیتے رہے کہ مسلمان کی زندگی کا اوّلین نصب العین اور مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے کہ اللہ راضی ہو جائے اور عاقبت سنور جائے۔

تعلیم

والدِ محترم نے اپنی ابتدائی تعلیم چنیوٹ میں ہی مکمل کی۔ میٹرک کے بعد غالباً ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ کالج لائلپور (فیصل آباد) جو اُس وقت ہائی سکول سے انٹر کالج کا درجہ حاصل کر چکا تھا میں داخلہ لیا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ جب میں داخلے کی درخواست لے کر پرنسپل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس وقت میں نے تہبند باندھ رکھا تھا۔ درخواست پرنسپل صاحب کے سامنے تھی۔ اُنہوں نے ایک نظر درخواست پر ڈالی اور دوسری نظر میرے لباس پر، مسکراتے ہوئے پرنسپل صاحب نے مجھے کہا:

Mr.Nazir you should be in proper dress

''مسٹر نذیر تمہیں مناسب لباس میں ہونا چاہیے''

والد صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب میں کہا:

Sir I am in proper dress

''جناب میں مناسب لباس میں ہوں''

پرنسپل صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے اور مجھے داخلہ مل گیا۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے ساتھ میرے بچپن کے دوست، ساتھی اور محلے دار مشہور مزاح نگار شاعر و ادیب جناب خضر تمیمی نے بھی داخلہ لیا۔ مشہور شاعر ن۔ م راشد بھی میرے کلاس فیلو تھے۔ اُن دنوں ن۔ م راشد، راشدنہیں خضری تخلص رکھتے تھے، ادھر خضر تمیمی بھی شاعر تھے جن کا نام مولا بخش تھا لیکن تخلص اُن کا خضر تھا۔ کالج میں دوسرے طلباء ن۔ م راشد کو ''خضر کی خضری'' کہہ کر چھیڑا کرتے۔ چنانچہ

ن۔م راشد نے تنگ آ کر حضری تخلص کو چھوڑ کر راشد تخلص رکھ لیا۔ والد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ن۔م راشد اور راجہ ایف۔ ایم ماجد جو دونوں بھائی تھے۔ ان کے والد اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں ایک عرصہ تک مدرس رہے اور ان بھائیوں کا بچپن چنیوٹ میں ہی گزرا تھا۔ بعد میں راجہ ایف۔ ایم ماجد میرے استاد ہوئے۔ Politcal science ''علم سیاسیات'' مجھے فیصل آباد گورنمنٹ کالج میں راجہ صاحب ہی پڑھاتے رہے۔ پھر لاہور میں بھی ایم۔ اے کے دوران یونیورسٹی میں Muslim Politcal thought میں نے راجہ ایف۔ ایم ماجد سے ہی پڑھا۔ ان کے بارے میں مزید تفصیلات آگے آئیں گی یہاں صرف اُن کا ذکر ہی کافی ہے کہ میں آج بھی اُن کی اہلیّت، قابلیت اور شرافت کا اُسی طرح قائل ہوں جس طرح پہلے تھا۔

والد محترم نے جس طرح ایک جگہ ٹک کر کام نہیں کیا ویسے ہی اُنہوں نے اپنا تعلیمی دور بھی ایک جگہ مکمل نہیں کیا۔ کالج کی تعلیم اگرچہ لائل پور گورنمنٹ کالج سے شروع کی لیکن جلد ہی لاہور اسلامیہ کالج چلے گئے، وہاں کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے پھر وہاں سے ایس۔ای کالج بہاول پور چلے گئے۔ اُن کے ماموں زاد بھائی محمد بشیر جو بعد میں ماسٹر بشیر کے نام سے چنیوٹ میں ایک ممتاز اور منفرد ٹیچر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اُن کے ہمراہ ایس۔ای کالج میں ہی زیرِ تعلیم رہے، والد محترم بتاتے تھے کہ ایس۔ای کالج غریب اور لائق طالب علموں کے لیے نعمتِ خداوندی سے کم نہ تھا۔ جہاں پر وہ تمام مراعات ایک اچھے طالب علم کو حاصل تھیں جو تعلیم جاری رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہوتی ہیں۔ ایس۔ای کالج کے ادبی مجلّہ کے ایڈیٹر بھی بن گئے۔ اسی کالج میں والد صاحب کا دوستانہ ڈاکٹر محمد باقر سے ہوا وہ والد صاحب کے کلاس فیلو تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ اورنٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے اور پھر کالم نگار کے طور پر بھی اُن کی اچھی خاصی شہرت رہی۔ فوج سے فارغ ہوئے تو کئی بار ہمارے گھر والد صاحب کو ملنے کے لیے آئے۔ مجھ سے بھی اُن کی ملاقات ہوتی تعلیم پر توجہ دینے کی تلقین کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر باقر صاحب میری تعلیم کے بارے میں میرے والد صاحب سے بھی زیادہ فکرمند ہیں۔ بچپن میں والد صاحب کی الماری میں ڈاکٹر محمد باقر کے خطوط جو انہوں نے والد صاحب کے نام لکھے، کی ایک بھاری بھرکم فائل بھی میری نظروں سے گزری۔ جو بعد میں کہیں لاپتہ ہوگئی ورنہ اُن خطوط سے والد محترم کی زندگی کے کئی پہلو سامنے آتے۔ ایس۔ای کالج بہاول پور والد صاحب کی زندگی میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا تذکرہ وہ اکثر کرتے۔ بتاتے تھے کہ اُن دنوں چنیوٹ ریلوے اسٹیشن نہیں تھا۔ ہمیں چنیوٹ سے چک جھمرہ جانا پڑتا جہاں سے ہم بہاول پور کے لیے گاڑی پکڑتے۔ بہاول پور شہر اور وہاں کے لوگوں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ لوگوں کی سادہ زندگی اور شرافت جس میں خلوص کی چاشنی نمایاں تھی نے شہر کی فضا کو پُرکشش اور پُرکیف بنا دیا تھا۔ شہر کے لوگ طالب علموں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بازار سے گزرتے طالب علموں کو دیکھ کر دکاندار کھڑے ہو جاتے تھے اور سلام کرتے، شاید اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے علم کی دولت سمیٹنے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و منزلت کرنی چاہیے۔ ہمارے شہر میں مہمان ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ یہ پوری

توجہ کے ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ بی۔اے کا امتحان اسی کالج کی طرف سے دیا اور تعلیم سے فارغ ہوگئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد والد محترم بمبئی چلے گئے۔ سیٹھ مہر بخش اور سیٹھ دین محمد دونوں بھائی چنیوٹ کی شیخ برادری میں سے تھے۔ بڑے وسیع پیمانے پر اُن کا کاروبار تھا۔ اتنی جائیداد کے مالک تھے کہ بقول والد مرحوم، حکومت نے بمبئی میں اُن پر مزید جائیداد خریدنے پر پابندی لگا دی تھی۔ یہ دونوں بھائی دادا جان کے دوستوں میں تھے۔ انتہائی خدا ترس، غریب پرور۔ اُنہوں نے دادا جان کو اجازت دے رکھی تھی کہ چنیوٹ کے کسی بھی لڑکے کو وہ جب چاہیں بمبئی اُن کے پاس بھیج دیا کریں۔ بمبئی میں والد صاحب کچھ عرصہ تک تو اُن کے پاس ملازمت کرتے رہے پھر جلد ہی بمبئی چھوڑ کر مختلف شہروں میں ملازمت کرتے رہے۔ بمبئی سے کلکتہ، کلکتہ سے آگرہ، آگرہ سے مدراس، مدراس سے لکھنؤ اور پھر لاہور۔ لاہور میں کچھ عرصہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار میں بھی کام کیا۔ کہا کرتے تھے کہ ظفر علی خاں سیر کے بڑے شوقین تھے اگر کوئی مہمان بھی اُن کے ہاں قیام پذیر ہوتا تو اُسے بھی صبح سیر کے لیے اُٹھا لیتے۔ پیدل چلنا شاید اُن کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ والد صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ مجھے کہنے لگے مجیدی چلو امرتسر کام ہے۔ لاہور سے بس پر بیٹھے تو بس راستے میں خراب ہوگئی۔ کہنے لگے کہ اب کون اس کی درستگی کا انتظار کرے امرتسر یہاں سے کونسا دور ہے۔ پیدل چلتے ہیں چنانچہ ہم دونوں پیدل چل کے امرتسر پہنچے۔ دوست واحباب اُن کے ہاں مہمان ٹھہرنے سے کتراتے تھے کہ صبح ظفر علی خان کے ساتھ لمبی سیر پہ جانا پڑے گا۔ ''شہرِ لبِ دریا'' کے مصنف کا والد صاحب کے بارے میں درج ذیل تجزیہ درست ہے کہ:

> ''سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد بھی علم سے اُن کا رشتہ استوار رہا۔ وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، درس وتدریس سے اگرچہ وابستہ ہوگئے لیکن ان کی سیماب صفت کو قرار نصیب نہ ہوا۔ کشتِ جاں میں کھلتی ہوئی کونپلیں نئی روشنی کی منتظر تھیں۔ ہمہ وقت سیر وسیاحت کی جستجو انہیں بے چین رکھتی، اوائل عمر میں اکثر یوں ہوا کہ وہ اچانک گھر سے نکل جاتے اور دور دراز علاقوں اور شہروں میں گھوم پھر کر چپکے سے واپس پلٹ آتے۔ کم سنی میں ہی دہلی، کلکتہ، لاہور مدراس، لکھنؤ، بمبئی غرضیکہ سارا برصغیر دیکھ لیا پھر یہاں سے جی بھر گیا اور جاپان جا پہنچے۔''

جاپان میں

میں ابھی والدہ ماجدہؒ کی گود میں تھا کہ والد صاحب نے چنیوٹ کی ہی شیخ برادری منوؤں کے ہاں ملازمت کر لی۔ جنہوں نے اُنہیں جاپان میں اپنے دفتر میں بطور آفس منیجر تعینات کر دیا۔ جاپان کے شہر ''کوبے'' ڈیڑھ دو سال تک رہنے کے بعد پھر لوٹ آئے۔ جب جاپان سے آئے تو میں تقریباً دو ڈھائی سال کا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اُنہیں پہلی دفعہ ہوش میں دیکھا جب میری والدہ ماجدہ نے اشارہ کر کے میرے کان میں کہا کہ ''دیکھو وہ تمہارے ابا جی آگئے ہیں'' سرخ وسفید دمکتا چہرا جس پر چیچک کے داغ اور سر پر کالے رنگ کی ٹوپی اُنہوں نے پہن رکھی تھی۔ یہ سب کچھ میرے تصور کی

سکرین پر آج بھی موجود ہے۔ والد صاحب جاپان سے بہت کچھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ایک بہت بڑا چمڑے کا صندوق تو صرف جاپانی کھلونوں سے بھرا ہوا تھا جو ہم نے برادری اور محلے داروں میں اپنے جاننے والوں میں تقسیم کیا۔ کھلونے بچے گلیوں اور بازار میں لیے پھرتے تھے اور ہمارے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ انہوں نے دیے ہیں۔ جب جاپان سے آئے تو اُن کا لباس کلیتاً فرنگی تھا۔ اُن دنوں کی ایک تصویر اب بھی میری البم میں موجود ہے۔ جاپان کے کسی سٹوڈیو کی بنی ہوئی ہے۔ جس میں پینٹ کوٹ پہنے گلے میں ٹائی لگائے ''فلٹ ہیٹ'' ساتھ رکھے بڑے نرالے انداز میں کیمرے کے سامنے بیٹھے ہیں برسوں بعد جب ایک دفعہ میں نے اُنہیں وہ تصویر دکھائی اور کہا کہ کبھی آپ ایسے بھی تھے۔ تو اُنہوں نے جھٹ اپنا قلم نکالا اور تصویر کے اوپر لکھ دیا ''زمانہ جاہلیّت میں''

ہم ذرا بڑے ہوئے تو ہمیں جاپان کی باتیں سناتے۔ اُن کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جاپانیوں سے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ ایک دن اُنہوں نے بتایا کہ میرے دفتر میں ایک جاپانی بھی ملازم تھا۔ اُس نے دفتر کے اوقات میں میرے پاس آ کر کہا کہ ''سر آج مجھے صرف ایک گھنٹے کی چھٹی چاہیے'' پہلے تو میں حیران ہوا کہ جاپانی چھٹی مانگ رہا ہے۔ پھر میں نے اُسے کہا کہ اچھا چلے جانا۔ وہ اُس وقت پر اپنی سیٹ سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ عین ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا دفتری کام میں مصروف تھا۔ اب مجھے تجسس کہ اس سے پوچھوں کہ آخر اُسے کیا ضرورت تھی کہ صرف ایک گھنٹے کے لیے کام چھوڑ کر کہیں جانا پڑا۔ چنانچہ جب دفتر بند ہونے والا تھا تو میں نے اُس جاپانی سے پوچھا کہ آپ کو کیا کام تھا کہ آپ نے ایک گھنٹے کی چھٹی لی۔ تو اُس جاپانی کا جواب تھا کہ:

''سر آج میری شادی تھی اور اس سلسلہ میں ایک خاص تقریب میں میری شرکت لازمی تھی، اُس ایک گھنٹے کی چھٹی کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور معذرت خواہ بھی۔''

اسی طرح کے اور کئی واقعات وہ سناتے۔ ایک دفعہ بتایا کہ میں ایک جاپانی سے راستہ پوچھ بیٹھا، مجھے جہاں جانا تھا اُس جگہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اُس جاپانی کو بھی اُس جگہ کا پتہ نہیں تھا۔ وہ میرے پاس ہی کھڑا ہو گیا اور دوسرے راہ چلتے جاپانی کو روک کر پوچھا، اُسے بھی معلوم نہیں تھا تو وہ بھی میرے پاس رک گیا۔ اس طرح چھ سات جاپانی میرے ارد گرد کھڑے تھے اور میں پریشان کہ میں نے کیا کیا، انہیں بھی پریشان کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں چلا جاؤں گا آپ اپنے کام پر جائیں، وہ نہیں مانتے تھے۔ بالآخر اللہ نے کیا ایک اور جاپانی آ گیا اُس نے مجھے راستہ بتایا تو وہ سات آٹھ جاپانی اُلٹا میرا شکریہ ادا کرتے، جہاں اُنہیں جانا تھا چلے گئے۔

والد صاحب کہتے تھے کہ جب بازار میں بھیڑ زیادہ ہو جاتی تو عورتیں اور مرد اپنے جسم کو سکیڑ لیتے تھے اور آہستہ آہستہ جاپانی زبان کا ایک لفظ ہر ایک کی زبان پر ہوتا جس کا مطلب تھا ''معاف کرنا، معاف کرنا'' ہماری طرح بھیڑ کے وقت دھکم پیل وہاں پر نہیں دیکھی گئی۔

ایک دفعہ میری عینک ''ٹرام'' میں رہ گئی میں نے نئی عینک خرید لی لیکن کچھ دنوں بعد جب میں پھر اُس ''ٹرام''

میں سفر کے لیے بیٹھا تو اُس کے Car Conductre نے میری وہ گم شدہ عینک واپس کرتے ہوئے مجھ سے اُلٹی معذرت کی اور میں حیران تھا کہ اُس نے مجھے کیسے پہچان لیا اور میری عینک کو کتنی احتیاط کے ساتھ اپنے پاس رکھا اس اُمید پر کہ کبھی تو میں اُسے دوبارہ ملوں گا۔

اس طرح کے کئی واقعات وہ ہمیں سناتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ قومیں اپنی زندگی کس انداز میں بسر کرتی ہیں۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھ لیا کہ ابّا جان آپ بھلا جاپان سے کیوں واپس آ گئے وہیں رہتے آج ہم بھی جاپانی ہوتے تو مزہ آ جاتا۔ کہنے لگے کہ مالکان کے ساتھ میرا معاہدہ تھا کہ سال کے بعد وہ میرے بچے بھی جاپان بلوالیں گے۔ سال گزرنے کے بعد جب میں نے تقاضا کیا تو اُنہوں نے ٹالنا شروع کیا۔ میں جان گیا کہ یہ لوگ وعدہ سے منحرف ہو چکے ہیں تو میں استعفاد دے کر واپس آ گیا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ چنیوٹ کا لڑکا جاپان میں عیش سے رہ رہا ہے بھلا چھوڑ کر کہاں جائے گا۔لیکن یہ اُن کی بھول تھی۔

لاہور میں قیام (روزنامہ پاسبان)

جاپان سے واپس آنے کے بعد اُنہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا کہ اب وہ اکیلے نہیں تھے۔ بیوی بچے بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اگر چہ یہ چار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا کنبہ تھا۔ (والدِ محترم، والدہ محترمہ اور ہم چھوٹے چھوٹے دو بھائی شبّیر، صغیر) تاہم ضروریات زندگی کسی نہ کسی روزگار کی تلاش کے لیے انسان کو مجبور کر دیتی ہیں۔ اور ویسے بھی والد صاحب نے کوئی پہلی دفعہ تو نوکری نہیں چھوڑی تھی اُنہیں تو ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ ایک کام چھوڑ کر دوسرے کام کے لیے منصوبہ بندی کرنا۔ اس بار اُنہوں نے لاہور سے ''روزنامہ پاسبان'' نکالنے کا منصوبہ بنایا، اور اس منصوبے میں چنیوٹ کے ہی ایک دوست کیپٹن ممتاز ملک اُن کے شریک کار تھے۔ چنانچہ ہمیں ساتھ لاہور لے گئے اور محلّہ مصری شاہ میں ایک مختصر سے مکان میں ہم رہائش پذیر ہوئے۔ یہی وہ مکان ہے جہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب نے ایک بڑا اکلنڈر دیوار پر لگا دیا تھا جس پر موٹے حروف میں الف۔ بے لکھی ہوئی تھی۔ مجھے الف۔ بے پڑھاتے تھے۔ اُس وقت میری عمر تین چار سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس عمر میں بھی میں بڑا ہوشیار اور دلیر تھا کہ ایک پڑوسی کا خالی تانگہ لے اُڑا اور بازار میں آ گیا۔ لوگوں نے شور مچایا اور مجھ سے اُس خالی ٹانگے کی جان چھڑائی یا پھر میری جان بچائی۔ اس طرح کے اور کئی اور واقعات اُس دور میں مجھ سے سرزد ہوئے جو شرارتی بچوں سے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی والد صاحب ہمیں دادا جان کے ایک دوست جنہیں ہم سب گھر والے ''پیرجی'' کہتے تھے کے ہاں لے جاتے۔ جب کبھی اُن کے گھر گئے چند دن گزر جاتے تو ہم خود اُن کے گھر جانے کا تقاضہ کرتے کہ وہ لوگ ہم بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور اُن کے گھر سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک دفعہ میں اپنے والد صاحب کی انگلی پکڑے سڑک کے کنارے چل رہا تھا کہ بہت سارے لوگوں کو ایک جگہ بیٹھے دیکھا، میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟ والد صاحب نے کہا کہ یہاں جلسہ ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ جلسہ کیا ہوتا ہے تو جواب ملا کہ لوگ ایک آدمی کی بات کو سننے کے لیے ایک

جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور جب وہ بات سن رہے ہوتے ہیں تو اُسے جلسہ کہا جاتا ہے۔ اب میں خیال کرتا ہوں کہ یہ جلسہ شاید موچی دروازے یا پھر دہلی دروازے کے باہر تھا۔ اور یہ سلسلہ تحریک مسجد شہید گنج کہ جب میں اپنی عمر سے اندازہ لگاتا ہوں تو ۳۷-۱۹۳۶ء کا سن ہی بنتا ہے اور پھر ''روزنامہ پاسبان'' اخبار بھی اُسی دور کی بات ہے کہ اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی اور ڈیکلریشن کیپٹن ممتاز ملک کے نام تھا جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی فوج میں انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں بھرتی ہو گئے تھے۔ لہٰذا اخبار بند کرنا پڑا۔ یہ بات بھی جب میں بڑا ہوا تو اُنہوں نے ہی بتائی کہ اخبار ضیغم احرار شیخ حسام الدینؒ کے ایک قابل اعتراض بیان کے شائع کرنے پر ضبط کیا گیا۔ تاہم اُن کے بیان کے مطابق اخبار بڑی کامیابی کے ترقیاتی مراحل طے کر رہا تھا۔ جہازی سائز کا پرچہ انتہائی اچھی طباعت کے ساتھ بہت جلد عوام مقبول ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں ''پاسبان'' کے کچھ پرچے اپنے گھر میں دیکھے تھے جن میں بیرون ملک ایجنسیوں کے نام اور پتے بھی درج تھے۔ اخبار ہر لحاظ سے ایک معیاری اخبار تھا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ مجھے ''شہرلب دریا'' کے اس تجزیے سے اتفاق نہیں کہ ''روزنامہ پاسبان کا اجراء کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کی بجائے وقتی تحرک اور ذاتی ذوق وشوق کی کارفرمائی تھی اس لیے اخبار کوئی مستقل اور ہمہ گیر صورت اختیار نہ کر سکا'' ایسا نہیں بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اخبار انگریز دشمنی اور اس سے نفرت کے اظہار کی وجہ سے بند ہوا۔ شیخ حسام الدینؒ کا وہ بیان ایسا تھا ہی تو اخبار بند ہوا۔ اور یہ نفرت تو ہمارے خاندان کے ہر فرد میں اس وقت بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔ منصوبہ بندی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی کہا جا سکتا ہے

ہم لوگ تھے اپنی وضع کے اور دھن میں رہتے تھے

یا پھر

ہر سود و زیاں سے بالا ہو کر ہم نے سچ کو پالا ہے
ہاں قدم قدم پہ لوگوں نے ہم کو ہی تو زنجیر کیا